

تفہیم القرآن

المعارج

نام | تیسری آیت کے لفظ ذی المعارج سے ماخوذ ہے۔ مراد یہ ہے کہ وہ سورۃ جس میں المعارج کا لفظ آیا ہے۔

زمانہ نزول | اس کے مضامین شہادت دیتے ہیں کہ اس کا نزول بھی قریب قریب انہی حالات میں ہوا ہے جن میں سورۃ الحاقہ نازل ہوئی تھی۔

موضوع اور مضمون | اس میں اُن کفار کو تنبیہ اور نصیحت کی گئی ہے جو قیامت اور آخرت اور دوزخ اور جنت کی خبروں کا مذاق اڑاتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چیلنج دیتے تھے کہ اگر تم سچے ہو اور تمہیں مجھلا کہ تم عذاب جہنم کے مستحق ہو چکے ہیں تو لے آؤ وہ قیامت جس سے تم ہمیں ڈراتے ہو۔ اس سورۃ کی ساری تقریر اسی چیلنج کے جواب میں ہے۔

ابتداء میں ارشاد ہوا ہے کہ مانگنے والا عذاب مانگتا ہے۔ وہ عذاب انکار کرنے والوں پر ضرور واقع ہو کر رہے گا، اور جب وہ واقع ہوگا تو اسے کوئی دفع نہ کر سکے گا، مگر وہ اپنے وقت پر واقع ہوگا۔ اللہ کے ہاں دیر ہے، اندھیر نہیں ہے۔ لہذا ان کے مذاق اڑانے پر صبر کرو۔ یہ اُسے دُور دیکھ رہے ہیں اور ہم اسے قریب دیکھ رہے ہیں۔

پھر بتایا گیا ہے کہ قیامت جس کے مبدی لے آنے کا مطالبہ ہوگا ہنسی اور کھیل کے طور پر کر رہے ہیں کیسی سخت چیز ہے اور جب وہ آئے گی تو ان مجرمین کا کیسا بُرا حشر ہوگا اُس وقت یہ اپنے بیوی بچوں، اور اپنے قریب ترین رشتہ داروں تک کو فدیہ میں دے ڈالنے

کے لیے تیار ہو جائیں گے تاکہ کسی طرح عذاب سے بچ سکیں، مگر نہ بچ سکیں گے۔
 اس کے بعد لوگوں کو آگاہ کیا گیا ہے کہ اُس روز انسانوں کی قسمت کا فیصلہ سراسر
 اُن کے عقیدے اور اخلاق و اعمال کی بنیاد پر کیا جائے گا جن لوگوں نے دنیا میں حق سے منہ
 موڑا ہے اور مال سمیٹ سمیٹ کر اور سنتِ سنیت کر رکھا ہے وہ جہنم کے مستحق ہوں گے۔
 اور جنہوں نے یہاں خدا کے عذاب کا خوف کیا ہے، آخرت کو مانا ہے، نماز کی پابندی کی ہے
 اپنے مال سے خدا کے محتاج بندوں کا حق ادا کیا ہے، بدکاریوں سے دامن پاک رکھا ہے، انت
 میں خیانت نہیں کی ہے، عہد و پیمان اور قول و قرار کا پاس کیا ہے اور گواہی میں راست بازی
 پر قائم رہے ہیں وہ جنت میں عزت کی جگہ پائیں گے۔

آخر میں مکہ کے اُن کفار کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر آپ کا مذاق اڑانے
 کے لیے چاروں طرف سے ٹوٹے پڑتے تھے خبردار کیا گیا ہے کہ اگر تم نہ مانو گے تو اللہ تعالیٰ
 تمہاری جگہ دوسرے لوگوں کو لے آئے گا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تلقین کی گئی
 ہے کہ ان کے تسخر کی پروا نہ کریں، یہ اگر قیامت ہی کی ذلت دیکھنے پر مصر ہیں تو انہیں اپنے
 یہودہ مشغولوں میں پڑا رہنے دیں، اپنا برا انجام یہ خود دیکھ لیں گے۔

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے

مانگنے والے نے عذاب مانگا ہے، (وہ عذاب) جو ضرور واقع ہونے والا ہے، کافروں کے

۱۔ اصل الفاظ میں سَائِلَ سَائِلٍ۔ بعض مفسرین نے یہاں سوال کو پوچھنے کے معنی میں لیا ہے اور وہ آیت
 کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ پوچھنے والے نے پوچھا ہے کہ وہ عذاب، جس کی ہمیں خبر دی جا رہی ہے، کس واقع
 ہوگا؟ واللہ تعالیٰ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ وہ کافروں پر واقع ہوگا۔ لیکن اکثر مفسرین نے اس جگہ سوال کو مانگنے
 اور مطالبہ کرنے کے معنی میں لیا ہے۔ نسائی اور دوسرے محدثین نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی
 ہے اور حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے کہ نضر بن حارث بن کلدہ نے کہا تھا اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هَذَا هُوَ الْحَقُّ مِنْ

لیے ہے۔ کوئی اُسے دفع کرنے والا نہیں، اُس خدا کی طرف سے ہے جو عروج کے زمینوں کا مالک ہے۔ ملائکہ اور روح اس کے حضور چڑھ کر جاتے ہیں ایک ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے۔ پس عِنْدِكَ فَاَمْطُرْ عَلَيْنَا مِجْرَامًا مِّنَ السَّمَاءِ اَوْ اِنَّا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (الانفال، آیت ۳۲)۔ ”خدا یا اگر یہ اتنی تیزی ہی طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا دے یا ہم پر دردناک عذاب لے آ“ اس کے علاوہ متعدد مقامات پر قرآن مجید میں کفار مکہ کے اس چیلنج کا ذکر کیا گیا ہے کہ جس عذاب سے تم ہمیں ڈراتے ہو وہ لے کیوں نہیں آتے۔ مثال کے طور پر حسب ذیل مقامات ملاحظہ ہوں: یونس، آیات ۴ تا ۸۸۔ الانبیاء، ۴ تا ۴۱۔ النمل، ۴ تا ۲۷۔ سبا، ۲۶ تا ۳۰۔ یس، ۵۲ تا ۵۴۔ الملک، ۲۴ تا ۲۷۔

۱۔ اصل میں لفظ ذی المعارج استعمال ہوا ہے۔ معارج، و معروج کی جمع ہے جس کے معنی زینے، یا سیڑھی، یا ایسی چیز کے ہیں جس کے ذریعے سے اوپر چڑھا جائے۔ اللہ تعالیٰ کو معارج والا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی ذات بہت بالا و برتر ہے اور اس کے حضور بارِباب ہونے کے لیے فرشتوں کو پے درپے بندیوں سے گزرنا ہوتا ہے، جیسا کہ بعد والی آیت میں بیان فرمایا گیا ہے۔

۲۔ روح سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں اور ملائکہ سے ابلیس کا ذکر ان کی غفلت پر دلالت کرتا ہے۔ سورہ شعرا میں فرمایا گیا ہے کہ نَزَلَ بِدَارِ الشُّوْحِ الْاَمِينُ عَلٰی قَلْبِكَ (اس قرآن کو روح امین نے کریمہ پر دل پر نازل ہوتے ہیں)۔ اور سورہ بقرہ میں ارشاد ہوا ہے قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلْجَبْرِیْلِ فَاِنَّہٗ نَزَّلَہٗ عَلٰی قَلْبِكَ (کہو کہ جو شخص جبریل کا اس لیے دشمن ہو کہ اس نے یہ قرآن تمہارے قلب پر نازل کیا ہے...)۔ ان دونوں آیتوں کو ملا کر پڑھنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ روح سے مراد جبریل ہی ہیں۔

۳۔ یہ سارا مضمون منشا بہات میں سے ہے جس کے معنی متعین نہیں کیے جاسکتے ہم نہ فرشتوں کی حقیقت جانتے ہیں، نہ ان کے چڑھنے کی کیفیت کو سمجھ سکتے ہیں، نہ یہ بات ہمارے ذہن کی گرفت میں آ سکتی ہے کہ وہ زینے کیسے ہیں جن پر فرشتے چڑھتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں بھی یہ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کسی خاص مقام پر رہتا ہے، کیونکہ اس کی ذات زمان و مکان کی قید سے منترہ ہے۔

۴۔ سورہ حج، آیت ۷۴ میں ارشاد ہوا ہے ”یہ لوگ تم سے عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہیں۔ اللہ

ہرگز اپنے وعدہ کے خلاف نہ کرے گا۔ مگر تیرے رکبے ہاں کا ایک دن نہاے شمار کے ہزار برس کے برابر ہوا کرتا ہے۔ سورہ السجدہ، آیت ۵ میں فرمایا گیا ہے ”وہ آسمان زمین تک دنیا کے معاملات کی تدبیر کرتا ہے، پھر اس کی روداد اور پُر اس کے حضور جاتی ہے ایک ایسے دن میں جس کی مقدار نہاے شمار سے ایک ہزار سال ہے۔“ اور یہاں عذاب کے مطالبہ کے جواب میں اللہ تعالیٰ کے ایک دن کی مقدار پچاس ہزار سال بتائی گئی ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ گئے ہیں کہ جو لوگ مذاق کے طور پر عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں ان کی باتوں پر صبر کریں اور اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ یہ لوگ اُس کو دُور سمجھتے ہیں اور ہم اُسے قریب دیکھ رہے ہیں۔ ان سب ارشادات پر مجموعی نگاہ ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسان اپنے ذہن اور اپنے دائرہ فکر و نظر کی تنگی کے باعث خدا کے معاملات کو اپنے وقت کے پیمانوں سے نپتے ہیں اور انہیں سوچا پس برس کی مدت بھی بڑی لمبی محسوس ہوتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک ایک ایکیم ہزار ہزار سال اور پچاس پچاس ہزار سال کی ہوتی ہے۔ اور یہ مدت بھی محض بطور مثال ہے، ورنہ کائناتی منصوبے لاکھوں اور کروڑوں اور اربوں سال کے بھی ہوتے ہیں۔ انہی منصوبوں میں سے ایک اہم منصوبہ وہ ہے جس کے تحت زمین پر نوع انسانی کو پیدا کیا گیا ہے اور اس کے لیے ایک وقت مقرر کر دیا گیا ہے کہ فلاں ساعت خاص تک یہاں اس نوع کو کام کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ کوئی انسان یہ نہیں جان سکتا کہ یہ منصوبہ کب شروع ہوا، کتنی مدت اس کی تکمیل کے لیے طے کی گئی ہے، کوئی ساعت اس کے اختتام کے لیے مقرر کی گئی ہے جس پر قیامت برپا کی جائے گی، اور کونسا وقت اس غرض کے لیے رکھا گیا ہے کہ آغازِ آفرینش سے قیامت تک پیدا ہونے والے سارے انسانوں کو بیک وقت اٹھا کر ان کا حساب لیا جائے۔ اس منصوبے کے صرف اُس حصے کو ہم کسی حد تک جانتے ہیں جو ہمارے سامنے گزر رہا ہے یا جس کے گزشتہ ادوار کی کوئی جزوی سنی تاریخ ہمارے پاس موجود ہے۔ رہا اُس کا آغاز و انجام، تو اسے جاننا تو درکنار اسے سمجھنا بھی ہمارے بس سے باہر ہے، کجا کہ ہم اُن حکمتوں کو سمجھ سکیں جو اس کے پیچھے کام کر رہی ہیں۔ اب جو لوگ یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ اس منصوبے کو ختم کر کے اس کا انجام فوراً ان کے سامنے لے آیا جائے، اور اگر ایسا نہیں کیا جاتا تو اسے اس بات کی دلیل قرار دیتے ہیں کہ انجام کی بات ہی سرے سے غلط و درحقیقت اپنی ہی نادانی کا ثبوت پیش کرتے ہیں (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم، الحج، حاشیہ)۔

اے نبی، صبر کرو، شائستہ صبر۔ یہ لوگ اُسے دور سمجھتے ہیں اور ہم اسے قریب دیکھ رہے ہیں۔ (وہ عذاب اس روز ہوگا، جس روز آسمان گھٹلی ہوئی چاندی کی طرح ہو جائے گا اور پہاڑ رنگ برنگ کے دھنکے ہوئے اُون جیسے ہو جائیں گے۔ اور کوئی جگری دوست اپنے جگری دوست کو نہ پوچھے گا حالانکہ وہ ایک دوسرے کو دکھائے جائیں گے۔ مجرم چاہے گا کہ اس دن کے عذاب سے بچنے کے لیے اپنی والدہ

یعنی ایسا صبر جو ایک عالی ظرف انسان کے شایانِ شان ہے۔

عہ اس کے دورِ مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ لوگ اسے بعد از امکان سمجھتے ہیں اور ہمارے نزدیک وہ قریب الوقوع ہے۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ قیامت کو بڑی دُور کی چیز سمجھتے ہیں اور ہماری نگاہ میں وہ اس قدر قریب ہے گویا کل پیش آنے والی ہے۔

عہ مفسرین میں سے ایک گروہ نے اس فقرے کا تعلق قیومِ کَانَ مَقْدَارًا خَمْسِينَ اَلْفَ سَنَةٍ سے مانا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ پچاس ہزار سال کی مدت جس دن کی بتائی گئی ہے اُس سے مراد قیامت کا دن ہے۔ مُسْنَد احمد اور تفسیر ابن جریر میں حضرت ابو سعید خدری سے یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کے متعلق عرض کیا گیا کہ وہ تو بڑا ہی طویل دن ہوگا۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ ”اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، دنیا میں ایک فرض نماز پڑھنے میں قنبا وقت لگتا ہے مومن کے لیے وہ دن اس سے بھی زیادہ لمبا ہوگا۔“ یہ روایت اگر صحیح سند سے منقول ہوتی تو پھر اس کے سوا اس آیت کی کوئی دوسری تاویل نہیں کی جاسکتی تھی۔ لیکن اس کی سند میں دراج اور اس کے شیخ ابوالہیثم، دونوں ضعیف ہیں۔

۹ یعنی بار بار رنگ بدلے گا۔

۱۰ چونکہ پہاڑوں کے رنگ مختلف ہیں، اس لیے جب وہ اپنی جگہ سے اکھڑ کر اور بے وزن ہو کر اُڑنے لگیں گے تو ایسے معلوم ہونگے جیسے رنگ برنگ کا دھنکا ہوا اُون اُڑ رہا ہو۔

۱۱ یعنی ایسا نہ ہوگا کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھ نہیں رہے ہونگے اس لیے نہ پوچھیں گے نہیں ہر ایک آنکھوں سے دیکھ رہا ہوگا کہ دوسرے پر کیا بن رہی ہے اور پھر وہ اسے نہ پوچھے گا، کیونکہ اس کو اپنی ہی پُری ہوگی۔

کو، اپنی پیروی کو، اپنے بھائی کو، اپنے قریب ترین خاندان کو جو اسے پناہ دینے والا تھا، اور روٹے زمین کے سب لوگوں کو فدیہ میں دے دے اور یہ تدبیر اُسے نجات دلا دے۔ ہرگز نہیں۔ وہ تو ٹھیکر تھی ہوئی آگ کی لپٹ ہوگی جو گوشت پرست کو چاٹ جائے گی، پکار پکار کر اپنی طرف بلائے گی ہر اُس شخص کو جس نے حق سے منہ موڑا اور پیٹھ پھیری اور مال جمع کیا اور سنت سنت کر رکھا۔

ﷺ یہاں بھی سورۃ الحاقۃ آیات ۳۳-۳۴ کی طرح آخرت میں آدمی کے بُرے انجام کے دو وجوہ بیان کیے گئے ہیں۔ ایک حق سے انحراف اور ایمان لانے سے انکار۔ دوسرے دنیا پرستی اور بخل جس کی بنا پر آدمی مال جمع کرتا ہے اور اسے کسی بھلائی کے کام میں خرچ نہیں کرتا۔

تفہیم القرآن کے اجزاء البقرہ، المائدہ، یوسف، النور اور الاحزاب کے بعد اسلامیہ کے طالب علموں کی سہولت کی خاطر۔

تفسیر سورۃ حجرات

بھی علیحدہ کتابی صورت میں شائع کی جا رہی ہے۔ ضخامت : ۵۶ صفحات سائز ۸×۲۳

کاغذ سفید۔ قیمت — ایک روپیہ پچیس پیسے

ادارۃ ترجمان القرآن ۵۔ الف ذیلدار پارک لاہور سے طلب فرمائیے